

## اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ

مفتی منیب الرحمن

قوم لوط پر عذاب نازل کرنے کے لیے حضرت لوط علیہ السلام کے پاس فرشتے آئے، تو اُن کی اخلاق باختہ قوم نے برے ارادے سے فرشتوں کی طرف پیش قدمی کی۔ اس پر حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا: ”اللہ سے ڈرو اور مجھے میرے مہمانوں کے بارے میں شرمندہ نہ کرو، کیا تم میں کوئی ایک شخص بھی راست نہیں ہے، (ہود: 78)۔“۔ لوط علیہ السلام کی قوم اللہ کے احکام سے باغی تھی اور اُن کی سرکشی فطرتِ سلیمہ کے بھی خلاف تھی۔ پھر بھی وہ اپنی قوم سے یہ توقع یا خواہش رکھ رہے تھے کہ ان میں کوئی ایک سلیم الفطرت شخص تو ہونا چاہیے، جو انہیں انسانیت کی کم از کم اخلاقی قدر یعنی مہمانوں کے احترام کی پاس داری کی طرف راغب کرے۔ اُن کا یہی جملہ ہم نے اپنے کالم کا عنوان بنایا ہے، جو اُن کے انتہائی دکھ کا اظہار ہے۔ گویا یہ تحشیہٴ مجموعی پورے معاشرے کے اخلاقی زوال کی انتباہ ہے کہ اُس معاشرے میں کوئی ایک بھی معقول اور بھلے مانس انسان نہ رہے، یعنی باطل پرست معاشرے میں بھی ایسے اشخاص کا وجود نیست ہوتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے یوسف علیہ السلام کو، اُن کے بھائی اپنے باپ یعقوب علیہ السلام سے جدا کرنے کی خاطر قتل کرنے پر آمادہ ہو چکے تھے، لیکن اُن میں سے ایک راست رو شخص نے کہا: ”یوسف کو قتل نہ کرو اور اُسے کسی گھر کے کنوئیں میں ڈال دو (شاید) کوئی راہ گیر اُسے لے جائے، اگر تم (کچھ) کرنا چاہتے ہو، (یوسف: 10)۔“ یعنی اگر تم ان سے نجات حاصل کرنا ہی چاہتے ہو یا انہیں اپنے باپ کی نظروں سے دور کرنا ہی چاہتے ہو، تو قتل کے گناہ کبیرہ میں مبتلا ہونے کے مقابلے میں ایک متبادل صورت بھی اختیار کر سکتے ہو۔ یہ رائے دینے والے یوسف علیہ السلام کے سوتیلے بھائیوں میں سے ایک سلیم الفطرت شخص تھے۔

ہمارے ہاں جناب پرویز رشید اور جناب شیخ رشید احمد جیسے صاحبانِ کمال تو ہیں، لیکن ہماری سیاسی قیادت کے اگلاٹے میں شاید کوئی ”رَجُلٌ رَّشِيْدٌ“ نہیں ہے۔ اس لیے ہم تحشیہٴ مجموعی اپنے سیاسی کچھر میں اخلاقی اقدار سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ ہم سیاسی اختلاف کو ذاتی دشمنی اور اختلافِ رائے کو جنگ و جدل میں تبدیل کر لیتے ہیں اور پھر اُس محاورے کا مصداق بن جاتے ہیں کہ: ”جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے۔“ ایک بار پہلے بھی ہم نے مشورہ دیا تھا کہ ہمیں اپنے اختلافات اپنے ملک کے اندر مل بیٹھ کر طے کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم اپنی ذاتی اور گروہی نفرتوں کو ملک سے باہر برآمد کریں اور دیگر ممالک میں موجود پاکستانی تارکینِ وطن کو بھی اس بنا پر باہم تقسیم کریں۔ کل لندن میں گولڈ اسمتھ کی رہائش گاہ پر جناب عمران خان کے خلاف پاکستان مسلم لیگ ن کا احتجاجی مظاہرہ ہماری اسی روش کا آئینہ دار تھا، جس کو دیکھ کر ہمیں افسوس ہوا۔ اس پر جناب عمران خان کو کسی اور کو ملامت کرنے کی بجائے اپنے آپ کو ہی ملامت کرنی چاہیے، کیونکہ: ”اے بادشاہ! میں آوردہٴ ثست۔“ اس روش کو بیرونِ ملک پروان چڑھانے میں یقیناً اُن کا حصہ دوسروں سے زیادہ ہے۔ اسی طرح ڈمی چوک کے دھرنے کے زمانے میں تہذیب سے عاری طرزِ تشاغل کا شعاع بھی انہوں نے شروع کیا۔ لیکن کسی ایک کی بے راہروی دوسروں کے لیے اس غلامِ شعاع کو اپنانے کا جواز نہیں بن سکتی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہماری سیاسی قیادت مل بیٹھ کر سیاسی اختلافات کے اظہار کے لیے کوئی کم از کم معیار اخلاق وضع کریں۔

اب الیکٹرانک میڈیا بھی اپنی متعدد انواع و اقسام کے باوجود بے اعتدالی، جانب داری اور بے مقصد شور شرابے کے سبب بے اثر ہوتا جا رہا ہے۔ جب سرشام نیوز چینلوں پر الفاظ کی اندھا دھند بمباری ہوتی ہے، تو لگتا ہے انگلی صبح طلوع ہونے سے پہلے وقت کے صاحبانِ اقتدار رخصت ہو چکے ہوں گے، لیکن منظر پھر وہی ہوتا ہے جو گزشتہ شکل تھا۔ یہی صورت حال ہمارے ہاں سوشل میڈیا کی ہے۔ یعنی کثرت سے سوشل میڈیا کا استعمال ہمارے ملک میں ہوتا ہے، شاید ہی کہیں اور ہو۔ اُس کا ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ ہم من حیث القوم فارغ لوگ ہیں اور ہمارے پاس وقت گزاری کے لیے کوئی مثبت میدانِ عمل نہیں ہے۔ مجھے سب سے زیادہ افسوس اُن مذہبی رہنماؤں پر ہے، جنہوں نے اپنے اپنے جیلے مجاہدینِ پال رکھے ہیں جو، اُن کے مخالفین یا مبغضین (Hated) کو، دشنام، لعن، طعن، تمسخر و استہزاء، عیب جوئی اور اہتمام و انزام، نیکی اور سعادت سمجھ کر کر رہے ہوتے ہیں، حالانکہ یہ شقاوت ہے اور دینی اقدار کے منافی ہے۔ اگر کوئی سمجھتا ہے کہ اس کے ذریعے وہ اپنے فریقِ مخالف کو نیست و نابود کر دے گا، تو اسے نرم سے نرم الفاظ میں سادہ لوحی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اس سے اپنا وقار و اعتبار کھونے اور فطرت و جبلت کے فساد کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، حیدر علی آتش نے کہا تھا:

فریبِ حُسن سے گم و مسلمان کا چلن بگڑا      خدا کی یاد بھولا شیخ، بُت سے برہمن بگڑا  
امانت کی طرح رکھا، زمیں نے روزِ محشر تیک      نہ اک مُو کم ہوا اپنا، نہ اک تار کفن بگڑا  
لگے مُنہ بھی چڑانے، دیتے دیتے گالیاں صاحب      زباں بگڑی تو بگڑی تھی، خبر لیجئے دہن بگڑا  
ہناوٹ کیب سے کھل گئی، اُس شوخ کی آتش      لگا کر مُنہ سے پٹانے کو، وہ پٹان شکن بگڑا

”گم“ آتش پرست کو کہتے ہیں۔ شاعر کا مذہب یہ ہے کہ جب اخلاقیات میں فساد اور بگاڑ آتا ہے، تو اچھے برے اکثر لوگ اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور نیک و بد کی تمیز باقی نہیں رہتی۔ شخصیتوں نے مصنوعی تقوے، سختی (درویشی) اور پارسائی کا جو لبادہ اوڑھ رکھا ہوتا ہے اور مٹنے کی کارگی کی ہوتی ہے، وہ سب بے نقاب ہو جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں کے پاس افکار کے ساتھ جینے کے لیے علم، نافع، عمل صالح اور ذریعہ تقویٰ کا سرمایہ نہیں ہوتا، لہذا وہ دوسروں کی توہین، تحقیر اور تذلیل کر کے اپنے نفس کو تسکین پہنچاتے ہیں اور پارسائی کے زعم میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ماضی قریب میں تو یہ مظاہر بھی دیکھنے میں آئے کہ ناکامی کو کامیابی قرار دے کر اور بے ہمتی کو مقاصد کا اثاثہ قرار دے کر مبارک بادیاں لینے اور دینے کا سلسلہ شروع ہو گیا، بھگت کبیر نے کہا تھا:

رنگی کو نارنگی کہیں، بنے دودھ کو کھویا      چلتی کو گاڑی کہیں، دیکھ کبیرا رویا

شاعر تضاد کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مالٹا رنگین ہوتا ہے، اُس کے نام سے ایک رنگ Orange Colour منسوب ہے، لیکن اردو میں اُسے ”نارنگی“ (یعنی بے رنگ ہونا) کہتے ہیں، اسی طرح دودھ ابال کر جہاد یا جائے تو اُس کا جوہر حاصل ہو جاتا ہے، اُسے اردو میں ”کھویا“ (ضائع ہونا) کہتے ہیں، حالانکہ وہ تو پایا ہوا ہوتا ہے۔ اسی طرح گاڑی رواں دواں رہنے والی مشین ہے، اُسے اردو میں ”گاڑی“ کہتے ہیں، جس کے معنی ہیں: کسی چیز کو زمین میں دفن کر دینا یا گاڑ دینا۔ اب ہمارے ہاں بھی نامردی کو مُرد اور ناکامی کو کامیابی سے تعبیر کر کے جشن منانے کا کچھ رائج کیا جا رہا ہے تاکہ عقیدت کے دام میں پھنسے ہوئے معتقدین کو بہلا کر رکھا جائے۔ اسی کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: ”جس نے



دین کا علم اس لیے حاصل کیا کہ وہ (مناظرے اور جہت بازی میں) علماء پر غلبہ پالے یا جاہلوں سے نجات بازی کرے یا لوگوں کے رُخ عقیدت کو اپنی جانب پھیر دے، تو یہ (علم) اُسے جہنم میں لے جائے گا، (ترمذی: 2654)۔“ اور آپ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص دنیا کمانے کے لیے (دین کا) ایسا علم حاصل کرے جس سے صرف رضائے الہی مطلوب ہونی چاہیے، تو ایسا شخص قیامت کے دن جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھے گا، (سنن ابوداؤد: 3664)۔“ الغرض علماء پر زیادہ ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ مالگوں کا اپنا عمل اور تیرہ کچھ بھی ہو، وہ علماء سے خیر کی زیادہ توقع رکھتے ہیں۔ لوگ عام طبقات میں اخلاقی اور عملی کمزوریوں کو برداشت کر لیتے ہیں، لیکن علماء کی گرفت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔ سو علماء کو زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے تاکہ ان کی کسی اخلاقی یا عملی کمزوری کے سبب لوگ دین کو طعن و ملامت کا ہدف نہ بنائیں۔ علماء پر طعن کرنے والے تو اس حد تک جا چکے ہیں کہ:

شیخ محشر میں جو پہنچے، تو اعمال نمدار، جس مال کے تاجر تھے، وہی مال نمدار رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا: ”یا رسول اللہ! لوگوں میں سے کسی کی آزمائش زیادہ سخت ہوتی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: انبیاء کی، پھر صالحین کی، پھر جو ان سے مرتبے میں قریب تر ہیں، پھر عام لوگوں میں جو اہل خیر کے شعار پر قائم ہیں۔ کسی شخص کی آزمائش اُس کے دینی مرتبے کے مطابق ہوتی ہے، اگر اُس میں دینی تہلُب (دین پر استقامت) ہے، تو اُس کی آزمائش بھی زیادہ ہوگی۔ اور اگر اُس کے دین میں کمزوری ہے، تو اُس کی آزمائش بھی کم تر ہوگی، (مسند احمد: 1481)۔“ اسی مفہوم کو کسی صاحب نظر نے ان کلمات میں بیان کیا ہے: ”جن کے رتبے ہیں بوا، اُن کو بوا مشکل ہے۔“ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور عرض کی: ”یا رسول اللہ! میں آپ سے محبت کرتا ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا: پھر تنگ دہی کے لیے تیار ہو جاؤ، (شعب الایمان: 1397)۔“

نوٹ: بوا کے معنی اضافی یا زیادہ کے ہیں، خالد محمود نقشبندی نے کہا ہے:

ہم کو اپنی طلب سے بوا چاہیے  
کیوں کہوں، یہ عطا، وہ عطا چاہیے  
غالب نے کہا تھا:

رکھو غالب! مجھے اس تلخ نواکی سے معاف  
اور شاعر نے کہا ہے:

جو مانگو گے ڈاکر، بوا پاؤ گے  
محمد سلیم سیاد نے لکھا ہے:

آج مشکل میں ہوں، کچھ درد بوا ہے ساقی  
مومن خان مومن نے کہا ہے:

شوق کم ملنے سے، اندوہ فزا ہوتا ہے  
ہائے پرہیز سے یہ درد سوا ہوتا ہے